Fikr-o-Nasar (Islamabad) 14:2 (1976)



# اقبالؒ بحیثیت مفسرِ قرآن

## اقبالؒ کی نظر میں قرآن پیغامِ انقلاب ہے

جی اے حق محمد

قرآن مجید اسلامی طرز زندگی کا مرکز و محور ہے یہ ایک ایسا آئینِ فطرت اور دستور انسانیت ہے جس نے ہر اس قوم کو بام عروج تک پہنچایا جس نے اس سے رہنمائی حاصل کی قرآن مجید کی اس قدر تفاسیر لکھی گئی ہیں کہ دنیا کی کسی اور کتاب پر اتنی خامہ فرسائی نہیں گئی۔ ہمارے پرانے (متقدمین) مفسرین نے ضخیم کتابیں مرتب کی ہیں۔ ان میں سے ہر کتاب اپنی جداگانہ خصوصیت رکھتی ہے۔ اپنے وقت میں ایک چیز خوبصورت اور فائدہ رساں ہوتی ہے۔ مگر وقت کے تقاضے بدلتے ہی وہی چیز اسی طرح مفید یا پرکشش نہیں رہتی۔ علمائے اسلام کا فیصلہ ہے کہ مفسرین کی تحریر کردہ ہر بات اس رتبہ کی حامل نہیں ہوتی کہ اس کو اللہ کے کلام کا اصل مقصد قرار دیا جائے اور نہ ہی وہ مفسرین اس بات پر اصرار کرتے ہیں کہ ان کی نقل کردہ روایات اللہ کے کلام کا اصل مُراد ہیں بلکہ اکثر مفسرین کا مقصد لغوی وسعت یا بلاغت کی وجہ سے پیدا ہونے والے مختلف احتمالات کو قلمبند کر دینا ہوتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ خود مفسرین کے نزدیک ان تفسیری روایات کا از روئے سند اور عبارت وہ مقام نہیں ہوتا جو محدثین کے نزدیک حدیثوں کی روایات کا ہوتا ہے بلکہ مفسرین کبھی کبھی ایسے اقوال و احتمالات بھی ضبطِ تحریر میں لے آتے تھے۔ جو اصول دین سے متعارض ہوتے تھے اور اس سے ان کا مقصد کوئی حقیقت منوانا نہیں ہوتا تھا۔ بلکہ صرف کسی قول یا احتمال کو ریکارڈ میں لانا ہوتا تھا خواہ وہ صحیح ہو یا غلط ،

بعض مفسرین کسی ایک فن میں مکمل مہارت رکھتے تھے اس لیے وہ اپنی تفسیر اسی زاویہ سے لکھتے تھے اور ضمناً اس فن کی تفصیلی مباحث بھی چھیڑ دیتے تھے۔ یہ سب باتیں اپنے وقت میں بہت اعلیٰ اور پیاری معلوم ہوتی تھیں۔ مگر اب ہم اپنی نوجوان نسل کو تفاسیر قرآن کی ایسی بھاری بھرکم بڑی بڑی جلدیں نہیں تھما سکتے۔ کہ ان کو پڑھیئے اور زندگی کے تمام معاشی و معاشرتی مسائل کے حل تلاش کیجیئے۔ جس طرح کہ آج ہم کسی کو یہ نصیحت نہیں کر سکتے کہ بھائی اگر تمہیں سینکڑوں میل کا سفر طے کرنا ہے تو ہوائی جہاز یا ریل گاڑی کی بجائے بیل گاڑی پر سوار ہو جایئے۔ اگرچہ یہ حقیقت اپنی جگہ مسلمہ ہے کہ جس وقت کسی نے بیل گاڑی ایجاد کی تھی تو یقیناً اس نے دنیائے انسانیت کی گرانقدر خدمت انجام دی تھی۔ آج وقت بڑی تیزی کے ساتھ گذر رہا ہے اور وقت کے تقاضے بھی اسی سرعت سے تبدیل ہوتے جا رہے ہیں آج ہر چیز سائنسی انداز اپناتی جا رہی ہے آج کی دنیا میں ہمیں جو کچھ کہنا ہے وہ جسقدر مختصر ہو سکے اسی قدر مؤثر اور قابلِ قبول عام ہوگا۔

وقت کے انہی بدلتے ہوئے تقاضوں کے پیشِ نظر قرآن مجید کو انسانیت کی عام بھلائی کے لیے بالکل سائنسی اور سادہ انداز میں پیش کرنا ہوگا اس کا احساس ہمیں علامہ اقبال نے دلایا ہے وہ کہتے ہیں

قرآں میں ہو غوطہ زن اے مردِ مسلماں
اللہ کرے تجھ کو عطا جدّتِ کردار

ان کی تمنا تھی کہ وہ خود قرآن مجید کی ایسی تفسیر لکھیں جو عام معاشرتی اور قومی مسائل میں نئی نسل کے لیے مشعلِ راہ کا کام دے سکے۔ جس طرح انھوں نے سر راس مسعود کو ۲۶ اپریل ۱۹۳۵ء میں لکھا۔

"اور اس طرح میرے لیے ممکن ہو سکتا کہ میں قرآن کریم پر عہدِ حاضر کے افکار کی روشنی میں اپنے وہ نوٹ تیار کر لیتا جو عرصہ سے میرے زیرِ غور ہیں، لیکن اب تو نہ معلوم کیوں ایسا محسوس کرتا ہوں کہ میرا یہ خواب شرمندہ تعبیر نہ ہو سکے گا۔ اگر مجھے حیاتِ مستعار کی بقیہ گھڑیاں وقف کر دینے کا سامان میسر آئے تو میں سمجھتا ہوں کہ قرآن کریم کے ان نوٹوں سے بہتر میں کوئی پیشکش مسلمانانِ عالم کو نہیں کر سکتا۔"

پھر حضرت علامہ ۳۰ مئی ۱۹۳۵ء کو انھیں لکھتے ہیں "چراغِ سحر ہوں بجھا چاہتا ہوں تمنا ہے کہ مرنے سے پہلے قرآن کریم سے متعلق اپنے افکار قلمبند کر جاؤں۔" علامہ نے قومی، سیاسی،

یا عام معاشرتی مسائل پر جن نظریات و افکار کا اظہار کیا ہے وہ ہر لحاظ سے قرآن مجید کے ساتھ ہم آہنگ ہیں۔ بلکہ ہمیشہ قرآن مجید ان کے قلب و دماغ میں رچا بسا رہا ان کے افکار و نظریات کی روشنی قرآن مجید کی چھلنی سے چھن چھن کر نور پھیلاتی رہی۔ وہ خود مولانا سید سلیمان ندوی کو ۱۴ مئی ۱۹۳۲ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں۔ "اگرچہ یورپ نے مجھے بدعت کا چسکا ڈال دیا ہے تاہم میرا مسلک وہی ہے جو قرآن کا ہے"۔ حضرت علامہ اپنی سوچ کے ہر زاویہ پر قرآن مجید کی چھاپ ضروری تصور کرتے ہیں۔

گر دلم آئینہ بے جوہر است ور بحرفم غیر قرآں مضمر است
روز محشر خوار و رسوا کن مرا بے نصیب از بوسۂ پا کن مرا

اقبال عظیم فلسفی بھی تھے اور انھوں نے فلسفہ کے کئی پیچیدہ مسائل پر بہت کچھ کہا ہے ان کا یہ کلام خالص فلسفیانہ زبان میں ہے مگر اقبال برٹرینڈ رسل کی طرح فلسفیانہ افکار و مسائل کو عوام کے لیے پیش کرنے کے قائل نہ تھے۔ کیونکہ فلسفہ کا ایک مخصوص مقام ہے اس کے قارئین اور شائقین کا ایک خاص طبقہ ہے عوام میں فلسفیانہ مباحث چھیڑنا نقصان دہ ہو سکتا ہے۔ اسی لیے اقبال کلام خداوندی کی آسان مؤثر اور عصری تقاضوں سے ہم آہنگ تفسیر کے خواہاں تھے کیونکہ خدا کا پیغام جو عام انسانوں کی عام معاشرتی زندگی کے لیے ہے اسے عام انسانوں کی زبان ہی میں پیش کرنا ضروری ہے۔

## تفسیر و تاویل

علامہ اقبال کے نزدیک غیر ضروری تاویلات کے بھنور میں پھنس کر اپنے ساتھ ہر انسان کو چکرا دینے سے متنفر کرنے والی بات ہوتی ہے ایسی تاویلات کے بارے میں کہتے ہیں۔

زمن با صوفی و ملا سلامے کہ پیغام خدا گفتند مارا
مگر تاویل شاں در حیرت انداخت خدا و جبرئیل و مصطفےٰ را

قرآن مجید کی تفسیر کا ایک حصہ تاویل بھی ہے۔ اوائل اسلام میں تاویل و تفسیر دونوں کا ایک مفہوم لیا جاتا تھا۔ مگر زمانہ گزرنے کے ساتھ مفسرین مختلف آراء اور گوناں گوں خیالات کا اظہار کرنے لگے اس لیے تاویل کو تفسیر سے جدا معنی میں لیا جانے لگا۔ امام راغب فرماتے ہیں کہ مفردات

القرآن کی شرح تفسیر ہے مگر کلام کے مجموعی مفہوم کا بیان تاویل ہے" امام قشیری کہتے ہیں کہ "تفسیر سماع اور اتباع پر موقوف ہے جب کہ تاویل استنباط و اجتہاد کا نام ہے" اور علامہ ثعلبی ان دونوں میں فرق واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "تفسیر سے مراد یہ ہے کہ کسی لفظ کے ایسے معانی بیان کیے جائیں جن کے لیے وہ لفظ وضع کیا گیا ہے اور تاویل یہ ہے کہ موضوع معانی کی بجائے باطنی مطالب کی تفصیل بیان کی جائے۔"

علامہ اقبال بھی بحیثیت مفسر قرآن "تاویل" کے بارے میں ایک نکتہ نظر رکھتے ہیں جو انھوں نے مختلف مواقع پر مختلف انداز میں ظاہر کیا ہے۔ مثلاً جناب نذیر نیازی کے نام اپنے ایک خط میں رقمطراز ہیں: "آیت نور کے متعلق میں نے جو کچھ لکھا ہے اسے تاویل کہنا صحیح نہیں ہے۔ تاویل کا لفظ اس وقت صحیح ہوتا ہے جب کسی آیت کے الفاظ کے عام معانی چھوڑ کر کوئی اور معانی لیے جائیں میں نے لفظ نور کے وہی معنی لیے ہیں جن میں یہ لفظ عام طور پر لیا جاتا ہے اگر آپ کہیں کہ اس آیت میں "نور" علیٰ ھذا القیاس "زجاج" وغیرہ سے کچھ اور مراد ہے تو یہ تاویل ہوگی۔ میں نے اپنے تمام لیکچرز میں اس قسم کی تاویل سے پرہیز کیا ہے اور الفاظ کو انھی معنوں میں لیا ہے جن میں عام طور پر مستعمل ہوتے ہیں۔ میرا عقیدہ ہے کہ حضور رسالت مآب کا یہی طریقہ تھا۔ یہی طریق بحث ابن حزم کا ہے مولانا روم کا یہ شعر میرے لیے نہ صرف دلیل راہ ہے بلکہ سوز و گداز کا بھی سامان ہے۔

ؔ کردۂ تاویل حرف بکر را — خویش را تاویل کن نے ذکر را

تاویل کے بارے میں حضرت علامہ کا نظریہ جیسے کہ انھوں نے خود کہا ہے وہی نظریہ ہے جو صاحب شریعت صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے اور جس کو اسلام کے نامور فرزند علامہ ابن حزم نے پسند کیا اور جس کو حکیم پاکزاد مرشد رومیؒ نے اپنایا اور جو علامہ ثعلبی نے اختیار کیا۔ علامہ ثعلبی کے نزدیک تاویل کے معنی یہ ہیں کہ لفظ جس معنی کے لیے وضع کیا گیا ہے اس لفظ سے وہی معنی مراد لیا جائے مگر علامہ فرماتے ہیں کہ لفظ کے عام مستعمل معنی کو چھوڑ کر دوسرا معنی لیا جائے تو یہ تاویل ہے ان دونوں میں بہت فرق ہے کیونکہ بسا اوقات ایک لفظ کا اصلی معنی جس کے لیے وہ لفظ موضوع ہے متروک ہو جاتا ہے اور لفظ کسی اور معنی میں عام طور پر مستعمل ہونے لگتا ہے۔ ایسے حالات میں اگر لفظ کا عام مستعمل معنی مراد لیا جائے گا تو علامہ ثعلبی کے نزدیک اس کو تفسیر نہ کہیں گے بلکہ

تاویل کریں گے مگر علامہ اقبال کے نزدیک یہ تفسیر ہوگی نہ کہ تاویل. چونکہ علامہ اقبال کا ذہن عام معاشرتی و معاشی مسائل کو سلجھانے کی فکر میں ہے اس لیے وہ اس چیز کو ترجیح دیتے ہیں، جو عام استعمال میں ہو۔ اس لیے علامہ اقبال کا نظریہ زیادہ قرینِ قیاس معلوم ہوتا ہے۔

ایک بات مسلّمہ ہے کہ حضرت علامہ انوکھی اور دور از کار تاویلات سے نہ صرف اجتناب کرتے تھے۔ بلکہ ایسی تاویلات کو قومی تباہی کا سبب اور اسلامی ثقافت کے لیے زہرِ ہلاہل تصور کرتے تھے. اپنی مشہور نظم "کتاب زندہ" میں کہتے ہیں۔

حرف اورا ریب نے تبدیل نے　　　آیہ اش شرمندۂ تاویل نے

بالِ جبریل میں کہتے ہیں ۔

احکام تیرے حق ہیں مگر اپنے مفسّر　　　تاویل سے قرآں کو بنا سکتے ہیں پازند

اس کا انہیں بہت دکھ تھا کہ مسلمان علماء اپنے سلف کی راہ سے ہٹ کر تحقیق اور حق گوئی کی قوت سے محروم ہو چکے ہیں۔ اس لیے وہ انتہائی قلق کے ساتھ بارگاہِ سیدالمرسلین میں عرض گذار ہوتے ہیں اور علماء وقت کی حالت یوں بیان کرتے ہیں۔

نماند آں تاب و تب در خونِ نابش
نروید لالہ از کشتِ خرابش
نیامِ او تہی از کیسۂ او
بطاقِ خانۂ ویراں کتابش

علامہ اقبال کے نزدیک مسلمانوں کی اس حالتِ زار کہ وہ معاشی طور پر تباہ حال ہو کر اپنی قومی حمیت، شجاعت، جذبۂ جہاد سے محروم ہو چکے ہیں۔ کی وجہ صرف یہ تھی کہ وہ قرآن مجید کو اپنی عملی زندگی میں نافذ نہ کرتے تھے۔ یا تو محض دل کو جھوٹی تسلی دینے کے لیے اس کو خوبصورت غلافوں میں سجا کر رکھ دیتے تھے یا اس کے حقیقی معانی کو چھوڑ کر ناقابلِ عمل تاویلات میں پھنسے باہمی تفرقہ بازی میں الجھ چکے تھے۔ مسلمانوں کے نزدیک اگر قرآن مجید کا کوئی بڑے سے بڑا مصرف تھا بھی تو یہی کہ مرتے وقت یا مرنے کے بعد سورہ یٰسین پڑھ لی۔ اللہ اللہ خیر سلّا۔ اقبال کو اس حالت پر رونا آتا تھا۔ ان کا دردمند دل اس بدبختی پر کڑھتا تھا اور خون روتا تھا۔ وہ ہر موقعہ پر قوم

کو اس غلطی کا احساس دلاتے تھے۔ ارمغانِ حجاز میں ہے ؎

بہ بندہ صوفی و ملا اسیری　　حیات از حکمتِ قرآں نگیری
بآیاتش ترا کارے جز ایں نیست　　کہ از یٰسین او آساں بمیری

حضرت علامہ کے نزدیک قرآن مجید کی پیچیدہ تاویلات میں پھنس کر دین سے نفرت کو اپنے ذہن کے گوشوں میں جگہ دینے کی بہ نسبت یہ بہتر تھا کہ چند لمحے کسی مردِ خود آگاہ کی محفل میں بیٹھ لیا جائے وہ کہتے ہیں۔

ز تاویلات ملایاں نکوتر　　نشستن با خود آگاہے دمے چند

یہ سبق انھوں نے اپنے مرشد رومی سے لیا تھا ان کا ارشاد ہے۔

یک زمانہ صحبتے با اولیاء　　بہتر از صد سالہ طاعت بے ریا

اقبال مردِ حقیقت شناس نے ایک اور نکتہ تک رسائی حاصل کی اور بڑی شد و مد کے ساتھ اس کی وضاحت کی کہ جب تک ذوقِ یقیں پیدا نہ ہو قومی فلاح و ارتقاء کی راہیں طے نہیں کی جا سکتیں۔ اور "خرد" ذوقِ یقیں سے بیگانہ ہوتا ہے۔ وہ فرماتے ہیں۔

خرد بیگانۂ ذوقِ یقیں است　　قمار علم و حکمت بد نشیں است
دو صد بوحامد و رازی نیرزد　　بنادانے کہ چشمش راہ بیں است

اقبال کہتے ہیں کہ ذوقِ یقیں کے لیے سوزِ دل ضروری ہے۔ اس کی کیا وجہ ہے کہ رہنمایانِ قوم کی تقریروں میں اثر نہیں ہے یہی کہ وہ بسا اوقات خرد کی فلسفیانہ موشگافیوں سے عاری ہوتے ہیں اور اگر عقلی استدلالات ان کے پاس ہوتے ہیں تو وہ سینہ میں دلِ پر سوز نہیں رکھتے اور اس خرابی کی وجہ سے وہ بیجا تاویلات میں پھنس جاتے ہیں۔ فلسفیانہ موشگافیوں کو اصل حقیقت سمجھ کر راہ سے بھٹک جاتے ہیں۔ ان کی باتوں میں اثر نہیں ہوتا بجائے اس کے کہ قوم میں ان کی باتوں سے دین کی محبت کے جذبات پھلیں پھولیں۔ الٹا دین سے نفرت کے خیالات جنم لیتے ہیں اس کا علاج یہی ہے کہ ان رہنمایانِ قوم میں سوزِ دل پیدا کیا جائے۔

بیا تا کار ایں امت بسازیم　　قمار زندگی مردانہ بازیم
چناں نالیم اندر مسجد شہر　　کہ دل در سینۂ ملا گدازیم

حضرت علامہ تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ میں ایک مقام پر قرآن مجید کی تعلیمات کو فلسفہ کی روشنی میں دیکھنے کے بارے میں کہتے ہیں۔

"علمائے اسلام نے قرآنِ پاک کا مطالعہ بھی فلسفۂ یونان کی روشنی میں کیا مگر یہ بات کہ تعلیماتِ قرآن کی روح یونانیت کے سراسر خلاف ہے ان کو کہیں دو سو سال کے بعد معلوم ہوئی وہ بھی پورے طور پر نہیں۔ الغرض اس انکشاف کا نتیجہ تھا کہ فلسفۂ یونان کے خلاف ردعمل شروع ہوا جس کی اہمیت کا اندازہ آج تک نہ ہو سکا۔ یہ کچھ اس بغاوت اور کچھ غزالی کے ذاتی حالات کا تقاضا تھا کہ امام موصوف نے مذہب کی بناء فلسفیانہ تشکیل پر رکھی، حالانکہ ان کا یہ خیال کلیتہً قرآن پاک کی تعلیمات کے نہ تو مطابق ہے اور نہ اس کو مذہب کی کوئی مضبوط اور پائیدار اساس قرار دینا ممکن ہے"

علامہ اقبال سراج الدین پال کے نام ۱۹ جولائی ۱۹۱۶ء کو لکھے گئے ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"کل میں ایک صوفی مفسر قرآن کی کتاب دیکھ رہا تھا لکھتے ہیں۔ خلق الارض والسمٰوات فی ستۃ ایام۔ میں ایام کے معنی تنزلات یعنی ستۃ تنزلات ہیں کم بخت کو معلوم نہیں کہ عربی زبان میں یوم کا یہ مفہوم قطعاً نہیں اور نہ ہو سکتا ہے کیونکہ تخلیق بالتنزلات کا مفہوم ہی عربوں کے مذاق اور فطرت کے خلاف ہے۔ اس طرح ان لوگوں نے نہایت بے دردی سے قرآن اور اسلام میں ہندی اور یونانی تخیلات داخل کر دیئے ہیں۔"

حضرت علامہ عقلی استدلات سے انکار نہیں کرتے۔ قرآن مجید کی حکمتوں اور گوناگوں علوم کو عقلی فلسفیانہ مباحث کے ذریعے دنیا کے سامنے پیش کیا جانا چاہیے مگر قومی اصلاح کے لیے عام معاشرتی مسائل کے بارے میں دور از کار تاویلات نقصان کا باعث بنتی ہیں۔ اہم چیز جو قوموں میں انقلاب پیدا کرتی ہے وہ یہ ہے کہ عقل کے ساتھ دل کو بھی شامل کیا جائے، اقبال کہتے ہیں ؎

ز رازی حکمتِ قرآں بیاموز — چراغے از چراغِ او برافروز
ولے ایں نکتہ را از من فرا گیر — کہ نتواں زیستن بے مستی و سوز

قرآن مجید کے مطالب بیان کرنے کے لیے مستی و سوز کے جذبات ضروری ہیں۔ عقلی استدلات کو عشقِ حقیقی کی ہلکی ہلکی آنچ دی جائے تو ان سے کھوٹ نکل جاتا ہے اور ان میں عجیب تاثیر پیدا ہو جاتی ہے اگر قرآن کا مفسر دردِ دل کے جذبات میں ڈوب کر قرآن مجید کی تفسیر نہیں کرتا تو اس کی زبان